ترکی میں دینی بیداری

خلیل حامدی

اب سے چند سال پہلے عدنان میندریس مرحوم کے دورِ حکومت میں جب ترکیہ کے اندر لادینی سے دین کی طرف رجوع کا آغاز ہوا تھا۔ اُس وقت امریکہ، برطانیہ اور دوسرے مغربی ممالک میں خطرے کی گھنٹیاں بجنی شروع ہوگئی تھیں، اور یہ گھنٹیاں بجانے والے زیادہ تر یہودی نامہ نگار تھے۔ اس کا جو نتیجہ برآمد ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ اب پھر ترکوں کے اندر اسلام کی طرف بڑھتا ہوا رجوع دیکھ کر مغربی اخبارات نے وہی خطرے کی گھنٹیاں بجانی شروع کردی ہیں۔ ذیل میں ہم برطانیہ کے مشہور اخبار گارڈین کے ایک مضمون کا ترجمہ دے رہے ہیں جو اس کی ۲۷ راپریل ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں درج ہوا ہے۔ مضمون کا لکھنے والا ایک مشہور یہودی سام کوہن ہے اور وہ ترکیہ ہی میں مقیم ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"ترکی نے چالیس سال پیشتر سیکولرازم قبول کیا تھا اور اب تک اُس پر عمل پیرا رہا ہے۔ لیکن نصف صدی مکمل نہیں ہونے پائی کہ اب دوبارہ ترکی کے اندر قدامت پرستی کی رَو اُٹھ کھڑی ہوئی ہے اور ملک کے مختلف حصّوں میں اس کی پیش قدمی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ترکی کے ترقی پسند حلقے اس روز افزوں رَو پر گہرے اور شدید قلق اور تشویش کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ کمال اتاترک نے چالیس سال پیشتر ترکی معاشرہ کی جو تشکیل کی تھی یہ رَو اُس معاشرے کی عصری بنیادوں کے لیے شدید خطرے کا پیغام ہے۔

جہاں تک سلیمان ڈیمرل کی کنزرویٹو حکومت اور حکمراں پارٹی حزبِ عدالت کا تعلق ہے، یہ دونوں اس خطرے کے وجود سے انکار کر رہے ہیں۔ سرکاری نقطۂ نظر کی بنیاد یہ ہے کہ اتاترک کی اصلاحات پر ملک کے اندر جگہ جگہ جو حملے ہو رہے ہیں ان سے نمٹنے کے لیے ملکی عدالتوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ باقی رہی مذہبی مراسم کی ادائیگی تو اس پر کسی نوعیت کی پابندی لگانا درست نہیں ہے۔

ترکی میں جس روز سے "مذہبی حکومت" کی بساط لپٹی ہے اُس روز سے مذہبی آزادی کا مسئلہ ایک سخت متنازع فیہ مسئلہ بنا رہا ہے۔ اتا ترک کے عہد اور اس کے بعد یک جماعتی نظام کے دَور میں اسلامی تعصب (FANATICISM) کو کسی ذریعہ سے بھی سر اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن ۱۹۵۰ء کے بعد جب سے پارلیمانی جمہوریت کا نظام ملک کے اندر داخل کیا گیا، رجعت پسند عناصر نے پَر پُرزے نکالنے شروع کر دیئے اور وہ برابر اُبھرتے چلے گئے[1]۔ عدنان مندریس کی ڈیموکریٹک پارٹی نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد مذہبی جنون پر سے دباؤ کم کر دیا، اور دیہاتی آبادیوں اور قدامت پسند عوام سے ووٹ حاصل کرنے کی خاطر مذہبیت کو کھلی چھٹی دے دی[2]۔ ۱۹۶۰ء میں ترکی کے اندر فوجی انقلاب رُونما ہوا[3] اور ڈیموکریٹک حکومت اور اُس کے سربراہ عدنان مندریس کا تختہ اُلٹ دیا گیا۔ انقلاب کے ایک سال بعد عدنان مندریس کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ اور آج پھر حکمران پارٹی حزب عدالت کو موردِ الزام ٹھیرایا جا رہا ہے کہ وہ بھی ڈیموکریٹک پارٹی کی ڈگر پر چل رہی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حزبِ عدالت ڈیموکریٹک پارٹی کی قدرتی وارث اور جانشین سمجھی جاتی ہے۔

---

[1] یہ ہے مسلمان ممالک کے بارے میں اہلِ مغرب کا نقطۂ نظر۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان ملکوں میں اسلام کو دبانے اور مٹانے کے لیے ڈکٹیٹر شپ اور یک جماعتی نظام ہی موزوں ہے۔ پارلیمانی جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ مختلف پارٹیاں ملک میں کام کریں اور جو لوگ بھی عوام کے ووٹ زیادہ تعداد میں حاصل کریں ان ہی کے ہاتھ میں حکومت کا اقتدار ہو۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان عوام سے کوئی ایسی پارٹی ووٹ حاصل نہ کر سکے گی جو اسلام کی مخالف ہو۔

[2] دوسرے الفاظ میں یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ یک جماعتی نظام کے دَور میں ٹرکی کے مسلم عوام کی مرضی کے خلاف کام کیا جا رہا تھا۔ اور جب دوسری جماعت ملک میں قائم ہوئی تو انتخابات میں اس کو صرف اس وجہ سے کامیابی ہوئی کہ اس نے ملک کے مسلم عوام کی مرضی کے مطابق کام کرنے کا وعدہ کیا۔ دشمنانِ اسلام کو یہی جمہوریت ناگوار ہے۔

[3] یہ اعتراف کرتے ہوئے شاید ان لوگوں کو شرم آتی ہے کہ فوجی انقلاب خود نہیں ہوا بلکہ کرایا گیا، اور انقلاب کرانے والے یہ لوگ خود تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ترکی میں اسلام کے احیائے نو کے علمبرداروں کے حوصلے بڑھنے کا ظاہری سبب موجودہ حکومت کا روادارانہ (یعنی جمہوریت پسندانہ!) رویہ ہے۔ ان دنوں اکثر و بیشتر مسجدوں میں ائمہ اور خطباء علانیہ اپنی تقریروں میں اتاترک کی اصلاحات کی دھجیاں اڑا رہے ہیں۔ بلکہ کئی لوگوں نے واشگاف الفاظ میں اسلامی شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کیا ہے۔ بعض خطیبوں نے ـــــ جو منی اسکرٹ کے خلاف غیظ و غضب سے بھرپور تھے ـــــ عورتوں کو اکسایا کہ وہ آبرومندانہ روش اختیار کریں اور اپنے جسموں اور سروں کو ڈھانک کر نکلیں۔ اتاترک کی تصویروں اور مجسموں کے خلاف بھی کئی واقعات پیش آچکے ہیں۔ یہ تصویریں اور مجسمے ملک میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ پچھلے چند ماہ سے ترکی میں رجعت پسندانہ (یعنی اسلام کے حامی!) اخبارات اور رسائل اچانک اور بکثرت منظر عام پہ آرہے ہیں[1]۔ اور ان میں سے بعض کھلم کھلا مذہبی حکومت کی بحالی کی دعوت دے رہے ہیں۔ دوسری طرف متعدد ایسی تنظیمیں جو مذہبیت کے اندر غرق ہیں برسر عمل آگئی ہیں اور انہوں نے اپنی سرگرمیاں تیز کردی ہیں۔ یہ تنظیمیں ایسا لٹریچر تقسیم کر رہی ہیں جس میں موجودہ دستور کو بدلنے اور نظام خلافت کو زندہ کرنے اور اس نوعیت کی دوسری چیزوں کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ ان تنظیموں کی رہنمائی اور تقویت کا مرکز اخوان المسلمون کی جماعت اور ہمسایہ عرب ممالک کی اسلامی تنظیمیں ہیں۔ اگر آپ بستیوں میں جائیں تو دیکھیں گے کہ مسلمان معلّمین (جنہیں ترک "خوجہ" کہتے ہیں) بڑی سرگرمی کے ساتھ سیکولر اسکولوں کا مقابلہ کر رہے ہیں اور "اسلامی اسکول" قائم کرتے چلے جارہے ہیں۔ اس سلسلے میں بنیادی مشکل یہ ہے کہ بستیوں اور چھوٹی چھوٹی دیہی آبادیوں کے اندر حکومت کے سیکولر اسکولوں کی تعداد ناکافی ہے جس کی وجہ سے مذہبی دیوانوں کو کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

حال ہی میں ایک نیا واقعہ پیش آیا ہے۔ انقرہ میں شریعت کالج کے طلبہ نے اس بنا پر احتجاجی ہڑتال کردی کہ کالج کی ایک طالبہ کو لیکچر روم سے نکال دیا گیا تھا کیونکہ اُس نے سر کو اوڑھنی سے ڈھانکنے پر اصرار کیا تھا۔ اس

[1] الحمد للہ کا شکر ہے کہ ترکی میں اب متعدد اسلامی اخبارات وجود میں آگئے ہیں جو اپنے معیار کے لحاظ سے لادینی اخبارات سے کسی طرح بھی کم نہیں ہیں۔ روزنامہ "اتحاد" اور "بگن" ان میں سرفہرست ہیں۔ اب وہ وقت گیا جب صرف احمد سلیمان کا "وطن" اخبار ترکی کا واحد ترجمان سمجھا جاتا تھا۔

واقعہ پر تمام طلبہ نے نہ صرف ہڑتال کر دی بلکہ ڈین سے مستعفی ہو جانے کا مطالبہ کیا اور اُسے "طلبہ کا دشمن" قرار دیا۔

ترکی اخبارات میں اس قضیہ پر مفصل بحث ہو چکی ہے اور اب یہ معاملہ پارلیمنٹ میں پیش کر دیا گیا ہے۔ حزب عدالت کے بعض نمائندوں نے پارلیمنٹ کو اس قضیہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور وہ اس طالبہ کی حمایت کر رہے ہیں۔[1]

بعض تنظیموں نے جو اپنے آپ کو "وطن پسند" اور "کنزرویٹو" کے اسماء سے متعارف کرا رہی ہیں، عوامی مظاہرات بھی کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ ان مظاہرات کا مقصد بظاہر ملک کے اندر کمیونزم اور بائیں بازو کی روز افزوں سرگرمیوں کے خلاف احتجاج ہے تازہ واقعہ ہے کہ انقرہ اور استنبول میں وسیع پیمانے پر یہ مظاہرے ہوئے ہیں۔ مظاہرین نے سبز رنگ کے جھنڈے اور پلے کارڈ ہاتھوں میں اٹھا رکھے تھے، کیونکہ سبز رنگ کو اسلام پسندی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے جو نعرے لگائے تھے اُن کا مفہوم یہ تھا کہ "ترکی کے اندر اسلام کا بول بالا ہو کر رہے گا"۔ ان مظاہروں میں کمیونزم سے زیادہ سیکولرازم اور ماڈرن ازم کے خلاف جوش و خروش کا اظہار کیا گیا ہے۔[2]

مزید برآں ماہ اپریل ۱۹۶۸ء کے اوائل میں برصہ شہر میں دائیں بازو کی مختلف تنظیموں نے ایک عظیم

---

[1] ترکی اخبار روزنامہ "اتحاد" کے ذریعہ سے اس واقعہ کی جو تفصیلات ہم تک پہنچی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ انقرہ یونیورسٹی کے شریعت کالج کی ایک طالبہ جس کا نام عائشہ ہے عام رواج کے برعکس اپنا سر پوری طرح ڈھانکے ہوئے کلاس روم میں داخل ہوئی۔ پروفیسر صاحب نے اسے دیکھ کر کہا کہ "مغز کو کھول کر رکھو اور یہ پردہ اتار دو"۔ اس طنز کے جواب میں عائشہ نے جواب دیا کہ "میرا سر صرف وہی ننگا کر سکے گا جو میری میت کو غسل دے گا اس سے پہلے یہ سر ہرگز ننگا نہ ہوگا"۔ عائشہ کے اس جواب سے پروفیسر صاحب بہت برافروختہ ہوئے اور انہوں نے اُسے لیکچر روم سے اسی وقت نکال دیا۔ طلبہ نے اس پر سخت ناراضی کا اظہار کیا، مگر جب یہ قصہ پرنسپل صاحب تک پہنچا تو انہوں نے بھی پروفیسر صاحب کے موقف کی تائید کی۔ اس کے بعد طلبہ نے احتجاجی مظاہرے کیے۔ کئی روز تک یہ واقعہ ترکی کے اخبارات میں نمایاں سرخیوں سے چھپتا رہا۔

[2] مقالہ نگار نے اس "مذہبیت" کا ایک اہم پہلو ترک کر دیا ہے اور اگر اُس کا بھی ذکر کر دیا جاتا تو اُس کی بات مکمل ہو جاتی۔ وہ پہلو یہ ہے کہ ہر سال ترکی کے حاجیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پانچ سال سے ترکی حاجی تمام دنیا کے حاجیوں سے تعداد میں سبقت لے جا رہے ہیں اور مذہب کا نیا ولولہ اور نئی تڑپ لے کر واپس جا رہے ہیں۔

مشترکہ کانفرنس منعقد کی ہے جس میں اتاترک کی اصلاحات اور ۱۹۶۰ء کے فوجی انقلاب کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے۔ مقررین نے کانفرنس میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ نہ صرف اسکولوں اور ادب و آرٹ کو بلکہ تھیٹر اور سینما کو بھی اسلام کے رنگ میں رنگا جائے۔ انہوں نے ترکی زبان کے احیاء و تجدید کی بھی مخالفت کی اور باصرار مطالبہ کیا کہ "مجلس علمی برائے ترقی ترکی زبان" کو توڑ دیا جائے۔ مجلس علمی کے قیام کا مقصد ترکی زبان کو عربی الفاظ سے پاک کرنا ہے۔ اس کانفرنس میں یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ حکومت اتوار کے بجائے جمعہ کو پھر سے چھٹی کا دن قرار دے[1]۔

اس نئی "مذہبی مہم" میں "وطن پسند" اور کنزرویٹو تنظیمیں سیاست کے میدان میں بھی دخل اندازی کر رہی ہیں[2]۔ روایت پرست لوگ اور مساجد کے ائمہ اور خطباء کا معاندانہ رویّہ صرف بائیں بازو کی مخالفت تک محدود نہیں ہے بلکہ انہوں نے ملک کی سب سے بڑی اپوزیشن طاقت ری پبلکن پارٹی کو بھی اپنی مخالفت کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ یہ وہی پارٹی ہے جس کی داغ بیل اتاترک نے ڈالی تھی اور جسے خالصۃً بائیں بازو کی طاقت نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے معتدل بایاں بازو کہنا مناسب ہے۔ جوں جوں ایوان بالا کے ضمنی انتخابات قریب آ رہے ہیں یہ مہم زور پکڑتی جا رہی ہے۔ ان انتخابات کے لیے ۲ جون ۱۹۶۸ء کی تاریخ مقرر کی گئی ہے۔ ری پبلکن پارٹی کے قائد عصمت انونو یہ صراحت کر چکے ہیں کہ "یہ مہم اہل وطن کے درمیان تند و تیز عداوت پر منتج ہو گی۔ لہٰذا ملک کے تمام ترقی پسند عناصر کے لیے اب لادینی بنیادوں کو بچانا جن پر جمہوریہ ترکیہ کی عمارت قائم ہے انتہائی ناگزیر ہو گیا ہے۔" جدید مذہبی بیداری یا مذہبی لہر کے متوقع نتائج سے اکثر ترک[3] قلق و خوف کا اظہار کر رہے ہیں، اور بڑے غور سے اس کا جائزہ لے رہے

---

[1] مصطفیٰ کمال کی نام نہاد "اصلاحات" میں سے یہ بھی ایک "اصلاح" تھی کہ جمعہ کی چھٹی منسوخ کر کے اتوار کی چھٹی مقرر کی گئی تھی۔ گویا اس شخص کے نزدیک ترکی میں اکثریت مسلمانوں کی نہیں تھی جنہیں جمعہ کے روز نماز کے لیے مسجدوں میں جانا ہوتا ہے بلکہ عیسائیوں کی تھی جنہیں اتوار کے روز چرچ جانا ہوتا ہے۔

[2] یعنی اس یہودی مسخرے کو تو ترکی کی سیاست میں دخل دینے کا حق ہے مگر ترکی کے ۹۸ فی صد مسلمانوں کو اپنے ملک کی سیاست میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔

[3] یہ "اکثر ترک" کا لفظ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ مقالہ نگار کے نزدیک بے دین ترک ہی اصل ترک ہیں خواہ ان کی تعداد ملک کی آبادی میں ایک فی صد بھی نہ ہو۔

ہیں۔ انہیں یہ اندیشہ ہے کہ یہ لہر قوم کی صفوں میں پھوٹ اور افتراق کے گہرے بیج ڈال دے گی اور نہ صرف ملک کا امن و امان بھسم کر کے رکھ دے گی بلکہ پارلیمانی جمہوریت کا نظام بھی تلپٹ ہو جائے گا۔[1]"

یہ ہے وہ مقالہ جو برطانیہ کے اخبار میں اُس کے یہودی نامہ نگار کے قلم سے شائع ہوا ہے۔ اب ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ یہاں اس تبصرے کو بھی نقل کر دیں جو اس پر سعودی عرب کے اخبار "المدینہ" نے اپنی ۵ مئی کی اشاعت میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"اس مقالہ کو پڑھنے کے بعد چند باتیں ذہن میں پیدا ہوتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ مقالہ نگار کو اس امر کا شدید قلق اور اندیشہ ہے کہ ترکی میں اب لادینیت کا جنازہ اٹھنے والا ہے۔ اس مضمون میں ترکی کے جدید اسلامی رجحانات کی تصویر کشی اس انداز سے کی گئی ہے کہ گویا ترکی ایک "خوفناک بھوت" کے جنگل میں جا رہا ہے جو مقالہ نگار کے محبوب نظریہ لادینیت کو نگل لینا چاہتا ہے۔ مقالہ نگار کے اس قلق اور اندیشہ کے متعدد تاریخی اسباب ہیں۔

ترکی نے صدیوں تک الحاد اور صلیب پرستی کے حملوں سے عالم اسلامی کو بچائے رکھا ہے۔ یورپ کی طرف سے شرق اوسط پر تسلط قائم کرنے کے لیے جتنے منصوبے بنائے گئے ترکی کے بہادرانہ موقف نے انہیں ہر بار ناکام کیا اور تاریخ کی صاف شہادت موجود ہے کہ یورپی استعمار کو عالم اسلامی میں داخل ہونے کا صرف اس وقت موقع ملا ہے جب ترکی ضعف کا شکار ہو گیا۔ چنانچہ اسی وجہ سے استعمار نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ترکی کے اندر اسلامی رنگ کو ہر پہلو سے محو کرنے کی کوشش کی۔[2]

مگر اب مقالہ نگار کے خوف اور سراسیمگی سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے باوجود کہ چالیس سال سے ترکی کو زبردستی سیکولر معاشرے کی گود میں پروان چڑھانے کی کوشش کی جاتی رہی وہاں اب نوجوان ترکوں کے اندر ایسا

---

[1] ان الفاظ سے دنیا کو یہ خبر دی جا رہی ہے کہ اب ہم پھر ترکی میں انقلاب کرانے کی تیاری کر رہے ہیں۔

[2] یہ درحقیقت ایک بڑی خوشگوار تبدیلی ہے جو اب عالم عرب میں ترکی کے متعلق رونما ہو رہی ہے۔ جنگ عظیم اوّل کے زمانے میں برطانیہ کی سازشوں کے زیر اثر عربوں اور ترکوں کے درمیان نفرت و عداوت کی جو دیوار حائل کر دی گئی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب وہ ٹوٹ رہی ہے اور عربوں کی رائے عام اب علانیہ یہ تسلیم کر رہی ہے کہ ترکی قوم کو زک پہنچنے کا کتنا بڑا نقصان خود انہیں بھگتنا پڑا ہے۔

عنصر اُبھر رہا ہے جو دین کی طرف پلٹنے کی پُرزور دعوت لے کر اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ یہ نوجوان جنہوں نے لادینیت کے گہوارہ میں تربیت پائی ہے اور لادینیت کے دودھ سے پلے بڑھے ہیں، لادینیت کی ناکامیوں اور نقصانات کو بچشم خود دیکھ اور پرکھ چکے ہیں، اور اُسے رد کر کے دعوتِ حق کے علمبردار بن گئے ہیں۔ مقالہ نگار خوب جانتا ہے کہ اسلام اگر عقیدہ و نظام کی حیثیت سے ترکی میں بحال ہو گیا تو دوسرے لفظوں میں ترکی پھر اُسی ناقابلِ شکست اسلامی قلعہ میں تبدیل ہو جائے گا جس طرح ماضی میں رہ چکا ہے اور یہ قلعہ دشمنانِ اسلام کے تمام منصوبوں اور سازشوں کو حسب سابق پامال کر دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ یہودی مقالہ نگار ترکی میں مذہب کی اس نئی رو سے نمٹنے کی دعوت دے رہا ہے۔

مقالہ نگار اس خوف و قلق کے بارے میں معذور ہے۔ وہ نسلی اور متعصب یہودی ہے اور وہ اس سے بے خبر نہیں ہے کہ ترکی میں اسلام کا احیائے نو فلسطین میں عربوں کے مغصوبہ حق کو بھی واگذار کرا کے رہے گا اور وہاں سے یہودیوں کی بیخ کنی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے گا۔ اسی لیے مقالہ نگار نے اپنے مقالہ میں بار بار بین السطور اس بات پر اُکسایا ہے کہ اسلامی سیلاب کو جسے وہ قدامت پرستی سے تعبیر کرتا ہے، روکنے کے لیے بند باندھنے کے فوری اور موثر اقدامات کیے جائیں، قبل اس کے کہ یہ بیداری سام کو ہین اور اس کے ساتھی یہودیوں اور ڈونمہ کی مرغوب محبوب "لادینیت" کو بہا کر لے جائے۔ اس غرض کے لیے اُس کا اشارہ ذیل کی کارروائیوں کی طرف ہے:

حزبِ عدالت (جسٹس پارٹی) کو قصرِ حکومت سے نکال دیا جائے کیونکہ یہ کنزرویٹیو رجحانات کی علمبردار ہے اور اس نے مذہبی عناصر کے بارے میں "سہل انگاری" سے کام لیا ہے اور اسلام کے سیلاب کو بڑھنے اور پھیلنے کا موقع دیا ہے۔ حزبِ عدالت سے حکومت چھیننے کے لیے ہر تدبیر اختیار کی جائے، چاہے انتخابات میں دھاندلی کے ذریعہ سے اور چاہے نئے فوجی انقلاب سے۔ اصل مطلوب یہ ہے کہ عصمت اینونو کی ری پبلکن پارٹی کو ہر قیمت پر برسرِ اقتدار لایا جائے کیونکہ یہ اتاترک کی پارٹی ہے اور یہی اتاترک پر تنقید کرنے والوں کی خبر لے سکتی ہے۔

وطن پسند اور اصول پرست تنظیموں پر زور دار وار کیا جائے، یہاں تک کہ ان کا نام و نشان باقی نہ رہے اور اگر اس کے بعد ملک کے اندر کمیونزم کو بھی فروغ نصیب ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ

کوہین کی نگاہ میں کمیونزم اسلام کی نسبت کم "خطرناک" اور کم نقصان دہ ہے۔[۱]

وہ تمام رسائل و اخبارات جو اسلام کے داعی ہیں بند کر دیئے جائیں۔ کیونکہ یہ رسائل و اخبارات عوام الناس کو ان کا ماضی یاد دلا رہے ہیں اور ایک مرتبہ جب کہ سیکولرازم ترکی کو اُس کے ماضی سے "آزاد" کرا چکا ہے یہ اخبارات دوبارہ اسی ماضی کا اعادہ کرنا چاہتے ہیں۔ کوہین نے "ہمسایہ ممالک" کا تو صرف نام ہی لیا ہے ورنہ اُسے معلوم ہے کہ ترکی کے دونوں ہمسایہ ممالک شام اور عراق میں اس وقت "ترقی پسندانہ" حکومتیں قائم ہیں اور ان دونوں ملکوں میں اسلامی تحریک ابتلاء و آزمائش کے مرحلے میں ہے۔ اخوان المسلمون کی طرف بھی مقالہ نگار نے اشارہ کیا ہے، حالانکہ اخوان المسلمون کو کسی جگہ آزادی سے کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ درحقیقت مقالہ نگار کا مقصد ان تمام اسلامی تحریکوں سے ہے جو دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں پائی جاتی ہیں۔ مقالہ نگار یہ چاہتا ہے کہ تمام اسلامی تحریکوں کی سرکوبی کر دی جائے تاکہ کہیں سے اسلام کا نام نہ بلند ہو جو یہودیوں کو سراسیمگی میں مبتلا کر سکتا ہو۔ کیونکہ اسلام اگر غالب آ جائے تو لامحالہ اسرائیل اور عالمی صہیونیت ختم ہو کر رہے گی۔"

اخبار المدینہ کے اس تبصرے پر ہم کسی اضافے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

---

[۱] یہ صرف یہودیوں کا نقطۂ نظر ہی نہیں ہے بلکہ امریکہ، برطانیہ، اور پوری مغربی دنیا کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے اسی لیے ان لوگوں نے بڑے ٹھنڈے دل سے شام، مصر، الجزائر، عراق، یمن اور جنوبی عرب کو روس کی گود میں پھینکا ہے تاکہ اسلام کا کسی طرح استیصال ہو، خواہ اس کی جگہ کمیونزم ہی لے لے۔ اسلام اور کمیونزم کے درمیان کسی ایک کو انتخاب کر لینے کا سوال ان کے سامنے آئے تو یہ بلا تامل کمیونزم کو ترجیح دیں گے۔